افادات

علّامہ حمید الدّین فراہیؒ

دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح
سرائے میر، اعظم گڑھ، یو، پی

مطبوعہ تصانیف امام فراہیؒ

اُردو:

- تفسیر نظام القرآن (مجموعہ تفاسیر فراہی)
- اقسام القرآن
- ذبیح کون ہے؟
- آنحضرتؐ کا سلسلۂ نسب اور اہل کتاب
- اسباق النحو (اول و دوم)
- تحفۃ الاعراب (منظوم)

فارسی:

- نوائے پہلوی (فارسی دیوان)
- خرد نامہ (منظوم)

عربی:

- الامعان فی اقسام القرآن
- الرای الصحیح فی من هو الذبیح
- جمهرة البلاغة
- رسائل الامام الفراهی فی علوم القرآن (وهی تشتمل علی ثلاث رسائل: دلائل النظام، اسالیب القرآن، التکمیل فی اصول التاویل).
- فی ملکوت الله
- القائد الی عیون العقائد
- تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان (زیر طبع)
- مفردات القرآن - دراسة وتحقیق، الدکتور محمد اجمل الاصلاحی (زیر طبع)
- دیوان المعلم عبد الحمید الفراهی
- امثال آصف الحکیم

دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی (انڈیا)

Price Rs. 4

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

[توحید کے یہ مضامین مولانا کی تفسیر سورۂ اخلاص اور ان کی بعض دیگر تحریروں سے ماخوذ ہیں۔]

— ۱ —

لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ تمام مذاہب، باوجود ان کے باہمی سخت اختلافات کے، ایک ہی مرکز پر پہنچتے ہیں۔ یہ بات ایک پہلو سے صحیح بھی ہے مگر دوسرے پہلو سے بالکل غلط۔ اور اکثر لوگ اسی غلط پہلو کو سمجھتے ہیں۔ مذہب کی ابتدا بے شک ایک ہی ہے مگر ان کے انتہا میں مثل ان دو خطوں کے جو ایک نقطہ سے نکلے ہوں بے انتہا فرق ہے۔ ایک ہی شہر سے دو مسافر چلے، ایک نے پچھم کا رُخ کیا، دوسرے نے اُتّر کو۔ یہی حال اختلاف مذاہب کا ہے۔

اسی لیے اگر کوئی شخص ہر مذہب میں سے جزئیات اور زوائد کو دور کرنا چاہے اور محض ان کے کلیات اور اصول تک پہنچے تو اُسے سب ایک معلوم ہوں گے۔ مگر یہ وہی کرسکتا ہے جو تقلید سے بالکل پاک ہو اور نہ صرف آبائی مذہب کا بلکہ ہر ایک مذہب کا ایک وقت منکر ہو۔ یہ ایک ایسا مشکل کام ہے جس کا متحمل شاید ہی کوئی نیک دل شخص ہو۔ تقلید کی حالت میں وہ اصل اور زوائد میں فرق نہ کرسکے گا، اور اس فرق نہ کرنے سے اختلافات پیدا ہوگئے۔

— ۲ —

مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی گمراہی کا سبب نفس اور رب کے پہچاننے میں ان کی غلطی ہے۔ انھوں نے ایک صحیح بنیاد پر پوری نگاہ نہیں ڈالی اور دوسری صحیح بنیاد سے اغماض برت لیا۔ کیونکہ وہ ان مختلف بنیادوں کے مابین موافقت نہیں کر پائے۔ ہندومت، بدھ مت، مجوسیت، یہودیت اور نصرانیت جیسے عام مذاہب میں گمراہی شاید ان کے غلو، بدعات اور خواہشاتِ نفس کی راہ سے داخل ہوئی ہے۔

جہاں تک ہندومت کا تعلق ہے، اس کے ماننے والوں نے توحید کے معاملے میں غلو سے کام لیا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ وجودِ ذات کو ہم قدیم سے تعبیر کریں یا 'میں' سے، یہ ایک ہی بات ہے۔ اس گمان کے نتیجے میں ان کا دعویٰ یہ ہو گیا کہ 'اہم برہم' یعنی 'میں اللہ ہوں'۔ اس حقیقت تک رسائی کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ دنیا کو تیاگ دیا جائے اور ذات کو فنا کیا جائے۔ انھوں نے اپنی ہمت کے مرکز کو حقیقت کی صورت دے لی۔ یہی 'میں' کی حقیقت ہے۔ اس کے بعد انھوں نے یقین کر لیا کہ اس حقیقت کو پانے کے محکم قواعد موجود ہیں۔ جو شخص ان پر عمل کرنے کی مشقت اُٹھائے گا، وہ مراد کو پالے گا۔ رب کی طرف سے کسی رسول کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ رب تو خود آدمی کی اپنی ذات ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے نہایت مشکل مجاہدوں کا طریقہ اختیار کیا اور نفس کے انوار اور اس کی قوت کی بدولت وہ دھوکے میں پڑ گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندومت میں یہ جو کچھ ہوا یہ ان کے رشیوں کے غلو کے سبب سے ہوا۔ کیونکہ ان میں بعض ایسے ہندو بھی ہیں جو ایک قدیم معبود، جو ہر چیز کا خالق اور انسان کو ہدایت عطا فرمانے والا ہے، پر یقین رکھتے رہے ہیں۔ بعد کے ادوار میں ہندو چھ فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کے عوام پر بُت پرستی غالب آگئی۔

ہمارے اندر صوفیاء کے ساتھ بھی بعینہٖ یہی صورت پیش آئی۔ البتہ یہ ہوا کہ ان

کے اندر بعض صوفیاء نے کتاب وسنت کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ ان سے رہنمائی حاصل کرنے پر زور دیتے رہے اور غیبی انوار سے کسی دھوکے میں مبتلا نہیں ہوئے۔ انھوں نے یہی سبق دیا کہ اللہ تعالیٰ 'وراء الوراء ثم وراء الوراء' یعنی ہر چیز سے آگے اور آگے ہی آگے ہے۔

— ۳ —

مشہور مورخ گبن کہتا ہے:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اعتقاد گمان اور شبہ سے پاک تھا۔ اور قرآن مجید خدا کی توحید کی ایک عالی شان گواہی ہے۔ نبیؐ نے بتوں کی اور انسانوں کی، ثوابت کی اور سیاروں کی پرستش کو اس عقلی اصول پر باطل کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب ہوتا ہے اور جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا ہے اور جو چیز بگڑ سکتی ہے وہ ضرور فنا ہو کر رہے گی۔

خلّاق عالم کی پرستش اس کی عاقلانہ محبت نے اس اقرار کے ساتھ کی کہ وہ غیر متناہی اور قدیم ہے، صورت اور مکان سے منزّہ ہے۔ نہ کوئی اس کا بیٹا ہے اور نہ مشابہ، ہمارے چھپے سے چھپے خیالات پر مطلع۔ اپنی ہی ذات سے واجب الوجود، اور اپنی ہی ذات سے علم اور نیکی میں کامل۔

ان اعلیٰ حقائق کو جیسا کہ اس نبی نے فرمایا اس کی امت دل سے مانتی ہے۔ اور قرآن کے مفسروں نے ان کے معانی حکیمانہ درستی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ایک فلسفی موحد تو مسلمانوں کے عام عقیدہ کو تسلیم کر سکے گا مگر شاید ہم لوگوں کی موجودہ فہم سے یہ بہت بلند ہے۔"

اللہ نور السمٰوات والارض

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے

روشنی کے بغیر کسی چیز کو دیکھا نہیں جا سکتا لیکن روشنی بذات خود دکھائی نہیں دیتی۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز دکھائی دیتی ہے نظر اسی پر جا کر ٹھہر جاتی ہے جس کی وجہ سے آدمی اکثر روشنی ہی سے صرفِ نظر کر لیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کافر اللہ تعالیٰ کی ذات سے روشن اس کائنات کو دیکھتا ہے پھر بھی اس کا منکر ہوتا ہے اور اہل ایمان میں کچھ ایسے ہیں جو اس کے سوا کسی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔ گویا ان کی نظر ہمیشہ نور ہی پر رہتی ہے۔ پس باعظمت ہے وہ ذات جو بعض دلوں پر روشن اور بعض پر اپنے ظہور کے باوجود مستور ہے۔

ھو اللہ

"وہ اللہ ہے"۔ یعنی جس کی ہم بندگی کرتے ہیں وہ اللہ ہے۔ قرآن پاک نے اس مقدّس نام (اللہ) کا مفہوم اچھی طرح بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کلمہ سے مسلمانوں کے نزدیک وہ ذات پاک مراد ہے جس میں تمام کمالات و محاسن جمع ہیں اور جو تمام نقائص سے پاک ہے۔ اس سے اعلیٰ تو کیا اس کے برابر بھی کوئی نہیں۔ اور یہ معانی خود اس کلمہ میں مضمر ہیں اور اکثر مواقع پر قرآن پاک نے بعد بسم اللہ بطور شرح ایسے اسماء کا ذکر کر دیا ہے جن سے ان معانی کی طرف رہبری ہوتی ہے۔

عرب اس اسم مقدس ۔اللہ۔ کے مفہوم سے بالکل ناآشنا نہ تھے۔ البتہ اس کے اس مفہوم کی وسعت اور گہرائی سے غافل تھے اور اس لیے اس سے دور جا پڑے تھے۔ قرآن نے اس مفہوم کو اچھی طرح پر ظاہر کر دیا اور بتا دیا کہ اس کے لوازم سے غفلت کرنا درحقیقت اس کا انکار کرنا ہے۔ جب اس طرح سے مفہوم اس مقدس نام کا معلوم ہو چکا تو بتایا گیا کہ وہ جسے ہم پوجتے ہیں، اللہ ہے۔ پس ایک کلمہ ہزار کلمہ کے برابر ہو گیا، مثلاً اگر یہ بتا دیا گیا ہو کہ بادشاہ کے یہ یہ اوصاف ہیں تو کسی کو اس کہنے کی جگہ کہ وہ چنیں اور چناں ہے، یہ ایک لفظ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ بادشاہ ہے۔

اکثر جہاں غلطی سے بچانا یا کسی بات کو زیادہ دل نشیں کرنا ہوتا ہے وہاں اجمال کے بعد تفصیل مفید ہوتی ہے اور چونکہ توریت اور انجیل میں خدا کے صفات مذکور تھے باایں ہمہ نصاریٰ غلطی میں پڑ گئے اور اسی طرح مشرکین بھی خدا کو سب سے اعلیٰ مانتے تھے، پھر بھی فرشتوں کو اس کے ساتھ برابر نہ سہی تو چھوٹے درجے کا شریک بناتے تھے۔

اس تفصیل کی سخت ضرورت تھی۔ نیز اس تفصیل کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کو معلوم ہو کہ وہ درحقیقت خدا کو نہیں پوجتے اور محض جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں تاکہ وہ متنبہ ہوں کہ شرک نے ان کو بالکل خدا سے منقطع کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کو ان سے بوقت ہجرت اور قطع تعلق کے کہا گیا تھا (سورہ قل یا ایہا الکافرون میں اسی کی بحث ہے) کہ تمہارا خدا اور ہے اور ہمارا خدا اور۔

اب یہاں یہ کہہ دینے سے کہ ہمارا معبود اللہ ہے ظاہر کر دیا کہ وہ لوگ دوسرا معبود رکھتے ہیں۔ پس اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ وہ محبت الٰہی سے بالکل محروم ہیں اسم مقدس (اللہ) کے مفہوم کو (سورہ اخلاص میں) مفصل (احد: بے ہمہ یعنی یکتا، وحدہ لاشریک، ہمیشہ سے اور خالق کل، صمد: باہمہ سب کا مقصود، سب کا ملجا یعنی تمام قوت اور تمام احسان کا سرچشمہ، تمام رشتوں اور ذات برادری سے پاک اور بلند) بیان کیا تاکہ وہ اپنی حماقت کو سمجھ کر راہ راست پر آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ اسلوب بیان اختیار کیا جو غلطیوں کو براہ راست درست کرتا ہے۔ پس اگر خیالات باطلہ سے قطع نظر کی جائے تو صرف "ھو اللہ" کافی ہے۔

احد

(وحدہٗ لاشریک لہٗ)

کلمۂ احد عربی زبان میں صرف ذات پاک کی صفت میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس سے یکتائی اور بے ہمتائی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے (یعنی کوئی نہیں تھا تب بھی وہ تھا اور اب بھی ویسے ہی بے ہمہ — نرالا، اکیلا — ہے)۔ تمام رشتوں سے پاکی اور برتری اس کا مفہوم ہے۔ اس کلمہ کو سرسری نظر سے دیکھنا غلطی ہے۔ بنظر تدبر دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ وہ قدیم (ہمیشہ سے) ہے اور باقی سب مخلوق ہیں، کیونکہ جو سب سے پہلے آپ ہی آپ تھا وہ ہمیشہ سے تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ جو کبھی نیست تھا وہ خود تو کبھی ہرگز ہست ہو نہیں سکتا (یعنی جس کا وجود ہمیشہ سے نہ رہا ہو وہ اپنے آپ وجود میں نہیں آسکتا) اس لیے

دو بات ماننی ضروری ہوئی:

ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ دوسری یہ کہ اس کے سوا جو ہیں وہ سب اسی کی مخلوق ہیں (کیونکہ نہ وہ ہمیشہ سے ہیں اور نہ اپنے آپ ان کا وجود ہے)۔

مشرکین کبھی کبھی یہ شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم کیوں کر مان لیں کہ وہ معبود بے ہمہ ہے؟۔ اس سوال کے جواب کے لیے چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہوگا:

۱۔ تمام طاقتوں کا مدار، ہستی پر ہے۔ غیر متناہی (جس کی حد اور انتہا نہ ہو) طاقت متناہی ہستی (جس کی حد پیدائش اور موت سے متعین ہو یا جو فنا ہونے والی ہو) سے تناقض رکھتی ہے۔ عقل کے نزدیک "بقا" ایک ایسا اعلیٰ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس کے سامنے سب مرتبے ہیچ ہیں۔ اگر "فنا" ناتوانی کی نشانی ہے تو بقا کمال توانائی کی شہادت ہوگی۔

۲۔ اگر چند قدیم مانے جائیں تو ان میں سے کوئی بھی غیر محدود طاقت نہ رکھے گا۔ ملک قدرت تقسیم ہو جائے گا اور اسی طرح ملک تصرف بھی۔ ہر ایک کو ایک نئے عالم پر حکومت کرنی ہوگی۔

۳۔ عقل ہرگز دو متناقض باتوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ ایک ہی ذات کو محدود اور غیر محدود، کامل اور ناقص دونوں فرض نہیں کر سکتی۔ اب بنظر تامل دیکھو کہ قدامت (ہمیشگی) کو لازم ہے کمال (یعنی جو ہمیشہ سے ہے ضروری ہے کہ وہ کامل ہو) اور کمال کو لازم ہے یکتائی۔ پس قدیم کو متعدد کہنا نقیضین (دو متضاد باتوں) کو جمع کرنا ہے۔

دہری (زمانہ پرست) کو کہتے سنا کہ کچھ بھی قدیم نہیں۔ زمانہ کی گردش میں شام اور صبح یا رات اور دن، گرمی اور سردی، موت اور زندگی یکے بعد دیگرے "چکر" لگاتی رہتی ہیں۔ اور یہ چرخ یوں ہی چلتا آیا ہے اور چلتا جائے گا، اسی کو چاہو باقی کہو چاہو فانی۔ کاش دہری کی عقل اس گردش کون و فساد کو دیکھ کر خود چکرا نہ جاتی۔ اگر پائے فہم لڑکھڑایا تھا تو ذرا زانوئے فکر پر سر رکھ کر سوچتا کہ یہ کیا راز ہے کہ جو چیز اپنے تئیں فنا سے بچا نہ سکی وہ فنا ہو کر کیوں کر آسکی؟ ذرا سا تخم سڑ کر تناور درخت ہو گیا اور ایک تخم نے لاکھوں بلکہ بے شمار اور درخت بنا دیے۔ ایک دانۂ بے حقیقت کہ اس کو جہاں چاہو پھینک دو اور جب چاہو برباد کر دو۔ پیوند خاک ہو کر پہلے تو فنا ہو گیا اور پھر کیا سے کیا ہو گیا۔

ملحدین اور فلاسفہ کے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ ہر چیز کا نشو و نما اور اس کی تکمیل و ترقی ان قوتوں کا نتیجہ ہے جو خود اس کے اپنے وجود کے اندر چھپی ہوئی ہیں۔ وہی قوتیں اس کے لیے مناسب حال اعضا پیدا کرتی ہیں اور وہی اس کی تمام ضروریات پوری کرتی ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ خیال ایک لغو خیال ہے۔ اگر ہر چیز کا ارتقا اس کی اپنی اندرونی ہی قوتوں کی تحریک اور رہنمائی سے ہو رہا ہے تو آخر وہ ان چیزوں کے ساتھ موافقت اور سازگاری کس طرح پیدا کر لیتی ہے جو اس کے علم اور اس کی ضروریات کے دائرہ سے بالکل خارج اور نہایت دور ہیں۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی مخفی نہیں رہنی چاہیئے کہ یہ دنیا بحیثیت مجموعی ایک وحدت ہے اور اس کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو کھلے طور پر ناقص نظر آتے ہیں اور اس کا وجود اپنی تکمیل کے لیے کسی ایسے نوع کا تقاضا کر رہا ہے جس سے اس کے نقص کی تلافی ہو سکے اور جس کے ساتھ مل کر یہ اپنے مصالح کی تکمیل کر سکے۔

دوسرا رُخ یہ ہے کہ یہ تمام کائنات مختلف ایسی انواع سے بھری ہوئی ہے جو اپنی اصل، اپنے ماحول اور اپنے اسباب میں مشترک اور متحد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ یہ چیز اس بات پر دلیل ہے کہ اس کائنات کا انتظام کرنے والا ایک رب ہے جو ان تمام انواع کی ان کے نوعی تقاضوں کے مطابق تربیت کر رہا ہے اور لازماً وہ واحد بھی ہے اور ان سب سے بالاتر بھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان مختلف اجزاء کی باہمی کشمکش کے باوجود وہ اس طرح ان کی تدبیر فرما رہا ہے کہ ان میں سے کوئی جزء بھی دوسرے جزء سے متصادم نہیں ہو سکتا۔

یہ چیز جس طرح اس بات پر دلیل ہے کہ قدرت، تصرّف اور علم اور حکمت میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اس نے ہر چیز کے سپرد وہی کام کیا ہے جس کے وہ لائق ہے۔

یہ استدلال اپنے دونوں پہلوؤں سے جس طرح اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو واحد ہے اور اس تمام کائنات کی تدبیر فرما رہا ہے۔ اسی طرح اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ یہ خالق، مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ اس کا

علم اور اس کی رحمت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور آسمان سے لے کر زمین تک کی ہر چیز اس کے قبضہ و تصرّف میں ہے اور وہ ان کو اپنے بندوں کی خدمت اور نفع رسانی میں سرگرم کار کیے ہوئے ہے۔

جب اس کی رحمت اور قدرت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو ظاہر ہے کہ یہ اسی کی شان ہے کہ وہ سب کا ملجا و ماویٰ بنے۔

جس طرح اس کی اولیت سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ سب کا خالق ہے اسی طرح سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ تمام نعمتیں اسی کی بخشش ہیں۔ پس وہ سب سے بے نیاز ہوا اور سب اس کے نیازمند ہوئے، اور تمام خوبیاں جو کہیں بھی پائی جائیں ان کا مبدأ اور اصل وہی ذات ٹھہری۔ اس لیے ہر ایک حاجت مند اور حُسن پرست کا رُخ اُدھر ہی ہونا چاہیئے۔

کائنات میں جس ہستی کا وجود لازم ہے وہ صفت کمال رکھتی ہے۔ جب وجود محض نہ چھپا رہ سکتا ہے نہ بے کار رہ سکتا ہے تو پھر کامل ہستی کیسے معطل اور مخفی رہ سکتی ہے۔ لہٰذا اس کا تقاضا ہوا کہ ایجاد کرے۔ ایجاد وہاں ہوتی ہے جہاں پہلے کچھ نہ ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حرکت کے تصوّر کے لیے پہلے سکون کا تصور ضروری ہے۔ پس ذات قدیم نے عدم کو وجود کا، سکون کو حرکت کا، تاریکی کو روشنی کا، کمزوری کو قوت کا، پستی کو بلندی کا اور جبر کو اختیار کا جامہ پہنایا۔ اشیاء کو نمودار کیا، خلق پر شفقت اور کرم کیا، اس کو علم اور عزّت دی۔

اس نے انسان کے اندر علم اور جہالت، محبّت اور بغض، سخاوت اور بخل کی متضاد صفات کا امتزاج رکھا۔ جس کے باعث اس کو کوشش، محنت اور مشقت اور ترقی اور نشو و نما کا وسیع میدان میسّر آگیا۔ پس ناقص کے لیے کمال، کمزور کے لیے قوت، جہالت کے مقابلہ میں علم، اور شک کے مقابلہ میں یقین کا حصول مقصود قرار پایا۔ لیکن اولین ہستی ہی آخری ہستی بھی ہے اور باقی سب کو اسی طرف لوٹنا ہے۔ اس بات کو یوں فرمایا:

والی اللہ المصیر و للہ میراث السمٰوٰت والارض۔ (العمران ۱۸)	اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی وراثت ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز سے پہلے تھا۔ باقی سب اسی کی مخلوق ہیں۔ یہ سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان سب کا رُخ اسی کی جانب ہے اور وہی ان کا مقصود ہے۔

کامل وجود کے لیے لازم ہے کہ وہ قدیم، باقی رہنے والا، ازلی اور ابدی ہو۔ اس کی قوت اور پاکیزگی کمال کو پہنچی ہوئی ہو۔ لہٰذا اس نے جو کچھ چاہا وہ خیر ہے، جو کچھ واقع ہوا وہ خوب صورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وہی کرتا جو چاہتا ہے اور وہی چاہتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ پھر جس طرح ہستی اس پر ختم ہوتی ہے اسی طرح خیر و خوبی بھی اس پر ختم ہے۔ اگر یہ بات نہ مانی جائے تو اس کے وجود کا کمال مجروح ہوتا ہے پس:

ھوالاول و الآخر والظاھر	وہی اوّل اور آخر ہے اور وہی ظاہر
والباطن وھو بکل شئ علیم۔	اور وہی مخفی ہے اور وہ ہر چیز کا
(الحدید ۳)	جاننے والا ہے۔

پس جو مفہوم کہ اسم مقدس اللہ کے اندر کبریائی اور اولیت اور خالقیت مطلقہ اور رحمت عامہ اور حقیقی محبوبیت کا تھا وہ سب اس کلمہ سے سمجھا گیا اور یہ معانی اس سے درجہ بدرجہ حاصل ہوئے ہیں۔ اسی لیے پہلے معنی کے سوا دوسرے معنی اس لفظ سے بغیر تفکر اور تدبّر کے سمجھ میں نہیں آتے مگر قرآن ہم کو تاکید کرتا ہے کہ تدبّر اور تفکر سے کام لو۔ بے شمار آیتوں میں اس کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل کی عبادت یہی ہے کہ سوچے۔

صمد

(پشت پناہ اور حامی و مددگار)

بعض وہ معنی جو بے ہمہ (احد) میں جھلکتے تھے اور اس سے بہ تدبر سمجھے جاتے تھے اسے باہمہ (صمد) نے روشن کر دیا۔ محض اس کی بے ہمگی اور بے نیازی کو خیال کر کے بعض لوگوں نے تنگ فہمی کی وجہ سے اس کی بے شمار نعمتوں پر بھی کچھ توجہ نہ کی اور اسے ایک بے پروا اور گوشہ نشین علت العلل سمجھ لیا۔ پس ان کی غلطی کو دور کرنے کے لیے اس کی باہمگی کی تصریح کی حاجت ہوئی۔ خود بے شک بے نیاز ہے مگر سب کی دست گیری اور خبر گیری کرتا ہے۔

نصرت، مدد اور تسلی کا اعلیٰ قبلہ کوئی اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا۔

تمام قوت اور تمام احسان کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ جب مانگو عطا کرتا ہے۔ مانگنے کی خواہش بھی وہی بخشتا ہے۔ یعنی بلوا کر بخشش کرتا ہے بلکہ بن مانگے دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قبول نہ کرے تو یہ کام اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔ بندگی تو تمھیں کرو گے، تمھاری طرف سے وہ بندگی نہیں کر سکتا۔

احد اور صمد دو صفتوں کے ساتھ ساتھ ذکر کرنے سے ظاہر طور پر ان شبہوں کو دور کر دیا جو راہِ مستقیم سے اِدھر اُدھر ہٹا سکتے تھے۔ ان بظاہر دو متقابل صفتوں (یعنی سب سے بے نیازی اور سب کا قبلۂ نیاز مندی ہونا) کو مثل دو آئینۂ متقابل کے یک جا کر کے معرفت الٰہی کا جلوۂ کامل دکھلا دیا۔

درحقیقت چونکہ وہاں دوئی کا شائبہ نہیں ہے اس لیے دونوں صفتوں کو ایک ساتھ تصوّر کرنا اور دونوں کے اثر سے جو حالت معتدل بین الخوف والرجا پیدا ہوتی ہے اس پر ثابت قدم رہنا نہایت مشکل کام ہے۔ صفات باری میں تقابل کو جمع کرنا اس لیے مشکل ہے کہ اس کی ہر صفت غیر متناہی ہے اور اسی وجہ سے مجوسی کی عقل اس کی متحمل نہ ہوئی اور دو خدا مان لیے اور ہنود نے بلاضرورت تین فرض کر لیے: زندگی بخشنے والا، زندہ رکھنے والا اور زندگی لینے والا۔ مگر جب دوئی آئی کمال جاتا رہا۔ کمال کے ساتھ بقا بھی رخصت ہوئی۔ پس ایک خیال خام کو خدا بنا لیا جس کا کچھ بھی وجود نہیں۔ معدوم محض سے جی لگا کر ہلاکت کے سوا اور کیا مل سکتا ہے؟

گہری نظر سے آپ دیکھیں گے تو نظر آئے گا کہ یہ دنیا متضاد عوامل اور مختلف مدمقابل قوتوں کی ایک رزم گاہ ہے۔ یہاں زندگی اور موت، تخریب اور تعمیر کی ایک باہمی آویزش ہر گوشہ میں پائی جاتی ہے جن کی نگاہیں تہ تک پہنچنے کی عادی نہیں ہیں وہ اس حالت سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف الاغراض اور جنگ جو دیوتاؤں کا ایک اکھاڑا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں مجوس کو ٹھوکر لگی ہے اور وہ ثنویت کے چکّر میں پھنس گئے۔ اور یہیں سے مختلف بُت پرست قوموں نے بہت سے ایسے عقائد و نظریات پیدا کر لیے جو گمراہی میں مجوس کی ثنویت سے بھی بڑھ کر ہیں۔ حالانکہ یہ ٹھوکر محض فکر و نظر کی کوتاہی سے لگی۔ جن کی نگاہیں کشاکش

اور تصادم کے ان ظاہری مناظر سے گزر کر ان حکمتوں اور مصلحتوں تک پہنچ گئیں جو اس تصادم کے اندر پوشیدہ ہیں ان کو یہ حقیقت صاف دکھائی دی کہ اس دنیا کی خالق صرف ایک ہی قادر وقیوم ذات ہے۔

پس اس کائنات کے اندر قوتوں اور طاقتوں کا جو تصادم ہے، نگاہ کو اس پر ٹھہر نہیں جانا چاہیئے، بلکہ ان مصالح تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو اس تصادم سے پیدا ہوتے ہیں۔ تمام مصالح اور فوائد کا سرچشمہ درحقیقت متضاد اور متصادم قوتوں کا وجود ہی ہے۔ یہ جو کائنات کے ہر گوشہ میں ایک کشمکش اور تصادم آپ دیکھ رہے ہیں اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس کے اندر کوئی نظام ہی نہیں ہے۔ یہ کشمکش اور تصادم بھی درحقیقت اس کائنات کی ترقی اور نشوونما ہی کے لیے ہے۔ اس کشمکش ہی سے تغیرات کا وہ سلسلہ پیدا ہوتا ہے جو ہر پُرانی حالت کو ایک نئی حالت سے بدل رہا ہے تاکہ یہ نظام اپنی حالت پر قائم رہ سکے۔

قانونِ قدرت یہ ہے کہ دو چیزیں آپس میں ٹکرا کر اپنے سے ایک بالاتر حقیقت کو وجود میں لاتی ہیں۔ اس کارخانہ کے اندر کسی ایسے شر کا وجود نہیں ہے جس کے اندر سرے سے فائدہ کا کوئی پہلو ہی نہ ہو۔ پس اس دنیا میں جو چیزیں ہمیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں وہ بھی درحقیقت ایک دوسرے کی معاون ہیں۔ اس پوری دنیا کو اس کی مجموعی حالت میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ مختلف اجزاء و عناصر اور متضاد قوی اور عوامل کی ایک حسین وحدت ہے اور یہ تمام متضاد حالتیں — یمین و یسار، رات اور دن، آسمان و زمین، سردی اور گرمی، خوشی اور غمی اور نیکی اور بدی — اسی وحدت کے احوال و عوارض ہیں۔

نظام کائنات کے اس اصول پر ہونے کا اصلی مقصد ہمارے نفوس کی اصلاح و تربیت ہے۔ اس مادی دنیا کو اللہ تعالیٰ نے تاریک اور روشن اور پست و بلند اس لیے بنایا ہے تاکہ نفس انسانی کے لیے یہ ایک آئینہ کا کام دے۔

ان دونوں پہلوؤں کے اجتماع ہی سے انسان کی پرورش اور اس کی فلاح و بہبود کے گوناں گوں پہلو ظہور میں آتے ہیں اور ان دونوں کی تدبیر ہی سے روح کی ترقیاں اور

کامیابیاں ظہور میں آتی ہیں۔

توحید ہی دین فطرت ہے

حکمت اور رحمت کی جو نشانیاں انسان کو تمام عالم میں نظر آرہی ہیں اور اپنے رب کی طرف کشش جسے وہ مصیبت کے وقت محسوس کرتا ہے بتا رہی ہیں کہ کسی حاکم مطلق کی ہستی پر اسے اپنے اندر اور باہر سے گواہی مل رہی ہے۔ انسان کی فطرت مثل اور حیوانات کے نہیں۔ وہ غلام بنائے گئے اور اس کو آزادی بخشی گئی۔ جس کا لازمہ تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ترقی کرے۔ پس ان کو تو جس ڈگر پر چلانا تھا ہانک دیا اور وہ ویسے ہی چل رہے ہیں مگر انسان کو چراغ عقل اور توشۂ قابلیت دے کر میدان عالم میں چھوڑ دیا۔ پس اس کی فطرت اس کی قابلیت ہے۔ جس قدر انسان نے آج ترقی کی ہے سب اس کی قابلیت کے آثار ہیں اور اس کی فطرت ہی کے برگ و بار۔ اس بات سے کہ انسان کی فطرت ترقی کے بے انتہا مراحل طے کرتی ہے یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستہ پر پڑ جائے۔ پس آزادی رائے اور درازی راہ اس کے حصہ میں آئی۔ ان دو مشکلوں کے ساتھ ایک تیسری مشکل بھی لگ گئی جو ان دونوں سے کبھی جُدا ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی انسان نیکی اور بدی کے دوراہہ پر کھڑا کیا گیا، جس کے بغیر اس کے حق میں آزادی لفظ بے معنی ہوتی اور ترقی مراتب کے لیے عرصہ تنگ ہوتا۔ پس کوشش اور کشش انسان کے فطرت کا لازمہ ہوا۔ اور نیکی اور بدی کی کشمکش میں آگے بڑھنا اور نفس امارہ اور عقل آوارہ کو جادۂ اطاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا۔

انسان کو خدائے تعالیٰ نے ان دقتوں میں ڈال کر اس کی دستگیری کا وعدہ کیا ہے، اس کے اندر اور باہر سامان ہدایت موجود کر دیے۔ جس طرح بچۂ ناتواں کے لیے ماں کا آغوش مہیا کیا، اسی طرح نوع انسان کے لیے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ جو خدا زمین مُردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے وہی خدا اپنے کلام سے ویران دلوں کو آباد کرتا ہے۔ پس اس قدر سامان مہیا کر دینے کے بعد اگر انسان خدا سے روگرداں ہو تو

یہ نتیجہ فطرت نہیں بلکہ اس کی بے پروائی اور غفلت ہے۔

شرک کہاں سے پیدا ہوتا ہے

یہ مسئلہ کہ توحید داخل فطرت ہے اگرچہ ثابت ہو چکا، تاہم یہ سوال باقی ہے کہ شرک کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

اگر شرک جزوِ فطرت نہیں ہے تو کم سے کم یہ بیماری اس قدر کثیر الوقوع ہے اور اسی کے ساتھ مہلک بھی کہ اس کے اسباب کا دریافت کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ اس سے محفوظ رہنا ممکن نہ ہوگا۔ تفصیل کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش۔ بطور اصل الاصول کے یہ جاننا کافی ہے کہ شرک کے صرف دو سبب ہیں: غفلت اور دنائت۔ پہلا عقلی ہے اور دوسرا اخلاقی۔ اور یہ دونوں عدمی ہیں کیونکہ غفلت اسی کا نام ہے کہ انسان خدا کی بخشی ہوئی عقل سے جو بہترین تحفۂ فطرت ہے کام نہ لے۔ عقائد میں اوہام باطلہ اور اعمال میں فوائد عاجلہ کی پیروی کرے۔ اور دنائت یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کے سر پر تاج خلافت رکھا گیا وہ ایک مخلوق کی بندگی کرے اور باوجودیکہ اس کے لیے بزم قربت میں جگہ خالی رکھی گئی وہ اس دخمۂ وحشت کی نیرنگیوں پر فریفتہ ہو جائے۔

نتائج هٰذا التعليم فی هٰذه النّشأة

جب وہی ذات پاک سب کا ملجا و مرکز ہے اور تمام عالم کا روئے نیاز صرف اسی ہی کی طرف ہے تو تمام بندگانِ خدا ایک ہی سطح عبودیت پر آگئے اور ہر ایک قسم کا فرق جس سے بنی آدم ایک دوسرے کے ارباب بن رہے تھے مٹا دیا گیا۔ غلام اور آقا ایک کر دیے گئے، پیغمبر اور عامۂ امت کے حقوق برابر ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فَیٔ کو درمیان اپنے اور دیگر مسلمین کے بحصہ مساوی تقسیم کر دیا۔ انصار میں سے جب نقباء منتخب کیے تو اپنے تئیں بھی ایک نقیب قرار دیا، البتہ فطری اور ضروری فرق مراتب کا قائم رکھنا واجب تھا۔ مثلاً پیغمبر کی طاعت سب پر فرض تھی۔ ایک قسم کی بزرگی جو ادب اور

قیام معاشرت کی بنا ہے ملحوظ رکھی گئی جس طرح پر ماں باپ اور استاد کا ادب فرض ہے۔ بایں ہمہ اس کو ایسی حد معتدل پر رکھا جس سے کم کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً منع کر دیا کہ میرے سامنے عجم کی طرح کھڑے نہ ہو۔ مجلس میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ خادم سے کبھی کسی کام پر گرفت نہ کی۔ ایک شخص نے یکایک معلوم کر کے کہ آپ پیغمبر خدا ہیں لگا آداب خدمت بجا لانے، تو آپ نے فرمایا کہ میں تیرے مثل ایک آدمی ہوں۔ ابوبکر اور عمر اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حالات دیکھو تو معلوم ہوگا کہ بادشاہی کرتے تھے مگر فقیری کے لباس میں۔ حضرت عمرؓ کا خبر رساں شتر سوار کے ساتھ ساتھ دوڑنا اور جنس کی گٹھری کندھے پر رکھ کر ایک معمولی عورت کے گھر پہنچانا دیکھو، اور پھر یہ کہ تین عظیم الشان سلطنتیں جو ہر ایک بجائے خود شہنشاہی روئے زمین کا دعویٰ کر چکی تھیں ان کے قدموں پر تاج و تخت نثار کر رہی ہیں۔ اسلام کو صبغۃ اللہ اس لیے کہا گیا کہ اس خُمِ یک رنگی کا اصطباغ تمام رنگوں کو مٹا دیتا ہے، یہی روحانی اصطباغ ہے، اور یہی فطرتِ انسانی ہے۔ آدم علیہ السلام کی طینت جو غبار ہو کر پریشان تھی یہاں آ کر پھر مل جاتی۔ یہی خیرگاہ نوع انسان ہے اور یہی سجدہ گاہِ ملائک۔

بر درِ میخانۂ عشق اے ملک تسبیح گو
کاندر آنجا طینت آدم مخمر می کنند

اس میخانۂ عشق کا دوسرا نام اسلام ہے جہاں جامِ توحید کا دور چلتا ہے اور اس کا جرعہ خوار کلاہ کسریٰ اور تاج قیصر کو کفِ پا سے ملتا ہے۔

مگر اس بادۂ تند کے لیے ظرف چاہیے۔ جبلہ نے خلیفہ سے یہ حکم سن کر کہ اسلام نے معاشرت کی پست و بلند کو ہموار کر دیا ہے اور یہاں شاہ و گدا ایک ہی سطح پر کھڑے ہوتے ہیں، تاب نہ لا سکا اور پھر عیسائی بن گیا۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم بھی پرتو وحدت تھی اور انھوں نے مذاق عالم کو اس کی چاشنی پہلے بخش دی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی امت کے لوگ اسلام کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے فرما دیا تھا کہ اس سلطنتِ الٰہی میں شیفتگانِ متاعِ دنیوی کا داخل ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا، کیونکہ وہاں سلطنت کے ساتھ گدائی کرنی ہوگی۔ اونٹ کو سوئی کے ناکے میں

جانا ہوگا۔ پس ان کی تعلیم کی بنیاد ترک دولت تھی تاکہ نفس کشی کے خوگر ہو جائیں، اور وقعتِ دولت دل سے محو ہو جائے تاکہ جب دولت دی جائے تو اس کو ہیچ سمجھیں۔

التوحید فی الحقوق

دین جب فطرتِ انسانی ہے اور انسان نے اپنی بیگانگی کو چھوڑ کر نفس واحدہ بنایا اور اپنی فطرت اولیٰ پر لایا گیا تو ضرور ہوا کہ ان کے لیے ایک ہی عام قانون ہو۔ شریعت موسوی میں دیکھو تو صاف معلوم ہوگا کہ لاوی قبیلہ کو خدمت گار دینی بنایا گیا اور بلاشبہ برہمنوں کی طرح ان کے حقوق مقرر کیے گئے اور جو طریق عبادت کہ وہاں قائم کیا گیا اس کے لیے ایسے ہی لازم بھی تھا، مگر اسلام نے کوئی فرقہ پجاریوں کا نہ بنایا، ہر ایک شخص اپنا آپ کاہن بنا۔ ایک "اللہ اکبر" قربانی کے لیے کافی تھا اور مذبح پر خون چھڑکنا اور گوشت اور چربی اور گردوں کو جلانا اور اس قسم کے احکام جو عقل کی گردن میں طوق اور زنجیر تھے اور عبادت الٰہی کے چہرہ پر نقاب ڈال رہے تھے موقوف کر دیے اور بجائے اس کے کہ آسمان پر دھواں پہنچا کر دل کو تسلی دیں کہ خدا کو ہماری نذر پہنچی، یہ سچا طریق قربانی قرار دیا کہ بندگان خدا کو جن کے دل میں بھوک کی آگ جل رہی ہو آسودہ کرو اور ان کی شکر اور دعا کا بخور آسمان کی طرف بھیجو۔ یہاں ہر دل مذبح قربانی ہے۔ قربانی کرنے والا اور اس کا کھانے والا دونوں ایک ہیں۔ اس لیے اس کے کھانے میں دونوں برابر ہیں۔ یہ دعوتِ الٰہی کا فطری اور حقیقی طریقہ ہے۔ وہ ذات پاک "بے ہمہ" کھانے کا وہاں کیا کام۔ پھر وہ ذات پاک "با ہمہ" بھی ہے بندوں کو کھلایا تو اس کو قربانی پہنچی۔ اس دین فطرت کے تمام اعمال ایسے سیدھے اور صاف بنیاد پر رکھے گئے کہ اس میں بلندی و پستی اور پیچ و خم کی جگہ نہیں چھوڑی۔